Vol.6 No.4 2023

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

آنس معین کی شاعری کے فکری پہلو: تجزیاتی مطالعہ

Dr Majid Mushtaq
Assistant Professor, Department of Urdu,
Govt. College University, Faisalabad.
Dr. Shoaiba Moeed
Assistant Professor, Department of Urdu,
Uuniveristy of Sargodha, Sargodha.
Dr. Sami Ullah
Assistant professor, Department of Persian.
Govt. College University, Faisalabad.

Abstract:
Aanis Moeen is one of those poets who comitted suicide.He belongs to a literary family ,his father Fakhar-u-Din Ballay was a known writer.Aanis moeen started his poetic journy in sewnty seven and this journy ends with his death in 1986. He was a great poet of ghazal having equal potiential in nazam.His poetic work have a lot of worth having depth of thought and huminity.He has huminstic approch in poetry and shows great concern in it. This article highlights his poetic work as well as some aspects of his life. This article is an effort to recognize his work and to introduce his poetry to the students of Urdu Literature.

Keywords:*Suicide, Fakhar-u-Din Ballay, Illusion, Water, Symbol, Flood, Tragedy, Evolution.*

کلیدی الفاظ: خودکشی، فخر الدین بلے، سراب، پانی، علامت، سیلاب، المیہ، ارتقا

اردو شاعری میں ایسے شعرا کی تعداد کم نہیں ہے جنہوں نے جوانی میں وفات پائی۔ کچھ شعرانے تو خود کشی کے ذریعے خود اپنی زندگی کو موت کی آغوش میں دے دیا۔ آنس معین خود کشی کرنے والے شاعروں میں شامل ہیں خود کشی کے محرکات کچھ بھی ہوں ان کے علاوہ شکیب جلالی، ثروت حسین اور سارا شگفتہ شاعر بھی اس الم ناک عمل سے گزر چکے ہیں۔ آنس معین کا تعلق ایک علمی و ادبی گھرانے سے تھا۔ ان کے والد فخر الدین بلے نامور ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کے بھائی علی معین اس بارے میں کہتے ہیں:

”ہمارے گھر میں پچھلی تین نسلوں سے کوئی فرد ایسا نہیں جس نے شعر نہ کہا ہو آنس بھائی البتہ ہم سب سے الگ اور منفرد شاعر تھے۔“(۱)

آنس معین فخر الدین بلے کے ہاں 29 نومبر 1960ء کو ملتان میں پیدا ہوئے۔(۲) البتہ ڈاکٹر صفیہ عباد نے اپنی کتاب راگ، رت، خواہش مرد اور تنہا پھول میں ان کا سن پیدائش 1959ء درج کیا ہے۔(۳) اس سے اختلاف سے قطع نظر کہ ان کا درست سالِ پیدائش کیا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ان کی شاعری کے پہلوؤں کو دیکھا اور سمجھا جائے۔ 1986ء میں ٹرین کے نیچے آکر خود کشی کرنے والے آنس معین نے شاعری کا آغاز سترہ سال کی عمر میں کیا۔ یہ دور پاکستان کے سیاسی منظر نامے پر مختلف ہنگاموں کا دور تھا۔ ملک کی فضا پر آمریت کے سائے منڈلا رہے تھے۔ بڑے بڑے شاعر سرکاری سرپرستی کی خواہش میں ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ وہ لوگ جو سمجھتے نہیں کر سکتے تھے ان کے لیے وطن کی فضا سازگار نہ تھی۔ ان میں سے کئی ایک نہیں جلاوطنی اختیار کی تو بہت سوں کو قید و بند کی سہولتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس منظر نامے میں سترہ سالہ نوجوان کا شعری میدان میں قدم رکھنا اور اپنی الگ پہچان بنانا ایک کارنامہ رہا۔

صرف نو سال کے شعری سفر کے بعد آنس معین کا پختہ شعر ہی ان کی پہچان بنا۔ ان کا سفر مختصر مگر شعری رعنائی اور فکری پہلوؤں سے بھرپور تھا۔ ان کی مختصر زندگی میں انہیں نمایاں ادبی مقام تو نہیں ملا مگر ان کی شاعری ان کے بڑا شاعر ہونے کے تمام تر اوصاف سے مزین ہے۔ انہوں نے اپنے لیے موت کا انتخاب کیا۔ بعد از مرگ ان کی شاعری پر لکھے جانے والے مضامین میں انہیں بڑا شاعر ہونے کے تمام اوصاف سے متصف بتایا گیا ہے۔ اس حوالے سے جعفر شیرازی لکھتے ہیں:

”اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت آنس کوئی بڑا معروف شاعر نہ سہی مگر ایک بلند پایہ شاعر ضرور تھا اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف ہر اس ادبی شخصیت نے کیا ہے جسے اس آنس کا کلام پڑھنے اور سننے کا موقع ملا ہے۔“(۴)

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

آنس معین کے بطور شاید اعتراف کرنے والوں میں اولیت ڈاکٹر وزیر آغا کی ہے۔آنس معین کے والد فخر الدین بلے اپنے خط میں ڈاکٹر وزیر آغا کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سب سے پہلے آپ نے آنس کی سوچ کو غیر معمولی اور اس کے اشعار کو چونکا دینے والا کہا تھا اور یہ بھی فرمایا تھا کہ اس کے بعض اشعار سے تو مجھے خوف آتا ہے۔اسی طرح کوئی پانچ برس پہلے اس کے شعر سن کر جوش صاحب اور فیض صاحب نے جہاں داد دی تھی وہاں اس تشویش کا اظہار بھی کیا تھا کہ اس کی سوچیں اور لہجہ نہ صرف بڑا انوکھا بلکہ جھنجوڑ دینے والا ہے۔''(۵)

ایسا شاعر جسے نوجوانی میں ہی ڈاکٹر وزیر آغا جیسا نقاد سراہے اور فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی جیسے قد آور شعرا اس کی شاعری کو داد و تحسین سے نوازیں اس کی شاعری کس کاٹ دار شعری رجحان کی عکاس ہو گی۔

آنس معین کی شاعری نظم ہو یا غزل دونوں میں منفرد رنگ رکھتی ہے۔ان کا شعری تجربہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ان کی ابتدائی دور کی ایک غزل کے چند اشعار دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی شاعری کسی باطنی تذبذب کی سی کی کیفیت کسی بیرونی محرک کی پیداوار نظر نہیں آتی۔وہ انسانی تعلقات کی سطح پر ان گنت وہموں کو جنم دیتی ہے۔ان تعلقات میں غیر واضح اشارے انسان کو جس فطری تشکک میں مبتلا کرتی ہے اس کا اظہار ان شعروں میں خوبصورتی سے نظر آتا ہے۔محبت کے باہمی تعلق میں ادھوری رسائی کے واضح اشارے ہیں جو ان اشعار کو خوبصورت بناتے ہیں:

وہ میرے حال پہ رویا بھی مسکرایا بھی
عجیب شخص ہے اپنا بھی ہے پرایا بھی
یہ انتظار سحر کا تھا یا تمہارا تھا
دیا جلایا بھی میں نے دیا بجھایا بھی
بہت مہین تھا پردہ لرزتی پلکوں کا
مجھے چھپایا بھی تو نے مجھے دکھایا بھی(۶)

آنس معین کے اشعار میں خاص قسم کا ڈر ہے جو ان کی ذات کا محور و مرکز دکھائی دیتا ہے۔مگر حقیقت اس کے برعکس ہے وہ انسانی حسیات کا شاعر ہے وہ اپنے عہد کے انسان کا ترجمان ہے لہذا وہ ان کے احساسات اور جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ ان کے نزدیک انسان اپنے اندر کے خوف میں اس طرح گھرا ہوا ہے کہ اسے سارا ماحول اسیب زدہ نظر آتا ہے۔اس حالت میں اس کا اپنا وجود اسے غنیمت لگتا ہے مگر باطن میں پلتی سوچیں اظہار کے راستے تلاش کرتی ہیں اور اس عمل میں ایک خاص قسم کا ڈر اسے کھا رہا ہے جو اندر اور باہر کی دنیا میں جاری ہے وہ اسے شعر کا روپ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

نہ جانے باہر بھی کتنے آسیب منتظر ہوں
ابھی میں اندر کے آدمی سے ڈرا ہوا ہوں(۷)

ان کی شاعری میں تنہائی اور احساس تنہائی بھی نئی معنویتوں کے ساتھ اجاگر ہوتا ہے۔ان کی ذات کی الجھنوں اور اندرونی کشمکش کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔وہ اس تنہائی کو مختلف جہات اور علامتوں کے ساتھ پیش کرتے نظر آتے ہیں۔وہ تنہائی کے اس کلب کو محسوس کرتے ہیں اور اس احساس تنہائی میں خوف اور ڈر کو بھی اپنا ساتھی قرار دیتے ہیں۔ان کے ہاں پرندے اور اشیانے کی علامتیں بخوبی استعمال ہوئی ہیں۔یہ پرندہ وہ انسان ہے جو اس تنہائی کے احساس کے ساتھ نبرد آزما ہے اسے احساس کی شدت اس نہج پر لے آئی ہے کہ وہ اپنے خوف کو بھی تنہائی کا ساتھی قرار دیتا ہے۔یہ ناآسودگی جو انسان کے ساتھ ساتھ چلتی ہے وہ اس حالت کا شکار ہے۔اس پر اسے یہ بھی دکھ ہے کہ اس کی کیفیات کو سمجھنے والا کوئی نہیں۔وہ لکھتے ہیں:

ذرا تو کم ہوئیں تنہائیاں پرندے کی
اب ایک خوف بھی اس آشیاں میں رہتا ہے(۸)

آنس معین کے ہاں یہ تنہائی مختلف روپ دھارتی نظر آتی ہے۔وہ اسے کہیں سناٹے کی صورت دیکھتا ہے اور کہیں یہ تنہائی اسے اپنے دکھ درد کی صورت دکھائی

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

دیتی ہے۔وہ معاشرے کا حساس فرد ہے اس صحت کی انسان کے مسائل اور مصائب سے بخوبی واقف ہے۔وہ تنہائی کی اذیت میں مبتلا انسانوں کی حالت کا ادراک کرتے ہوئے اس قرب سے نجات کی بات کرتا ہے۔اس کے نزدیک تنہائی خود بھی اکیلے پن کا شکار ہے اسے سات مہیا کرنا بھی ضروری ہے۔انسانی نفسیات کا یہ پہلو بھی اہم ہے کہ وہ کسی کمی اور کجی کو پورا کرنے کے لیے ذرا سا آسرا بھی ایک مکمل اور بھرپور زندگی تصور کر لیتا ہے۔اس حالت میں اس کی نظر اپنے اندر کے دکھ اور گہرائی سے بڑھ کر اس دکھ میں مبتلا افراد پر جاتی ہے اور وہ اس احساس سے کسی کو نجات دلانے میں اپنے لیے عافیت محسوس کرتا ہے۔ان کا یہ شعر کئی جہاد میں یکتا ہے اور تہ در تہ نوعیتوں کا حامل دکھائی دیتا ہے۔وہ کہتے ہیں:

میں اس کو چھوڑ آیا تجھ سے ملنے
میری تنہائی تنہا ہو گئی ہے(۹)

پھر اسی تنہائی کو باہمی تعلق کے تناظر میں پیش کرتے ہوئے اس کو نئے معنی پہناتے ہیں:

ہو جائے گی جب تم سے شناسائی ذرا اور
بڑھ جائے گی شاید میری تنہائی ذرا اور(۱۰)

ان کی غزلوں میں سناٹا اور خاموشی بھی نئی نئے معنی لے کر آتا ہے۔کبھی وہ اس سناٹے کو مکان میں مکین دکھاتے ہیں تو کبھی یہ سناٹا انہیں اپنا ہمراز اور ہمزاد دکھائی دیتا ہے۔دراصل یہ سناٹا انسان کے لیے کبھی زہرِ قاتل کی طرح جذبوں کا قتل کرتا ہے تو کبھی اس سناٹے میں انسان آسائش اور آسودگی محسوس کرتا ہے۔دنیا کے ماحول میں حرص و ہوس کا ساتھ اور ہوس کا یہ شور جو فطرت کے مقابل اور مخالف کھڑا نظر آتا ہے۔اس حالت میں اس شور سے نجات سناٹے کی صورت میں ایک نعمت بن کر جاگزیں ہوتی ہے۔ان خاموشی کی بدلتی ہوئی کیفیات سے ان کے اشعار میں وہ چاشنی امڈ آئی ہے جو عموماً کم ہی دیکھی گئی ہے۔یہ اشعار دیکھیے:

شور سے تو شاید صدیاں بیت چکی ہوں
اب تک لیکن سہما سہما سناٹا ہے
کس سے بولوں یہ تو ایک صحرا ہے جہاں پر
میں ہوں یا پھر گونگا بہرا سناٹا ہے

محو خواب ہے ساری دیکھنے والی آنکھیں
جاگنے والا بس ایک اندھا سناٹا ہے(۱۱)

اور پھر اپنے اندر کی کیفیت کا اظہار بھی اسی سناٹے کے تحت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔اردو شاعری میں اس موضوع کو بار بار برتا گیا ہے کہ اندر کا موسم انسانی گفتار اور اعمال پر اثر انداز ہوتا ہے۔انسانی باطنی کیفیات اس کے افعال و اعمال کی محرک ہوتی ہیں۔آنس معین کے ہاں یہ نیا پن ملتا ہے کہ انسان اس کیفیت کا شکار ہو کر جہاں کوئی سوچ کوئی خیال رہنما نہیں۔زندگی کا یہ پھیکا پن سے اس موڑ پر لے آتا ہے جہاں اس کا بدن محض سانس جاری رکھنے کی ایک کل محسوس ہو۔زندگی کی کوئی رمق، کوئی صورت باقی نہ رہے تو سارا وجود بے معنی ہو جاتا ہے تو وہ اس صورتِ حال کا شکار نظر آتا ہے:

گونجتا ہے بدن میں سناٹا
کوئی خالی مکان ہو جیسے(۱۲)

آنس معین کا یہ شعری اظہار انہیں انفرادیت عطا کرتا ہے۔وہ اپنے جداگانہ اور انوکھے انداز سے بشری کیفیات کے اظہار کے علمبردار نظر آتے ہیں۔ان کے ہاں صرف بات نہیں کیفیات یا انفرادی احساسات کا اظہار ہی نہیں بلکہ معاشرتی جبر اور استحصال کا بھی مکمل اظہار نظر آتا ہے۔جبر اور گھٹن کے ماحول میں جہاں زباں بندی ہو زبان پر پہرے ہوں۔آزادیٔ اظہارِ رائے مفقود ہو جائے۔حاکم کا اشارہ ہی اذن ندا بنے وہاں انسان یا انسانی قدروں کی پامالی معمول بن جاتا ہے۔اس زبان بندی کے ماحول میں انسان کو اپنے پیچھے لگے خطرات کا مکمل احساس رہتا ہے۔آنس معین کا یہ احساس دیگر انسانوں کی طرح ذاتی درد نہیں بلکہ ان پابندیوں میں محبوب انسانوں اور ان کی حالت کا ادراک ہے۔وہ جانتے ہیں کہ انسان اس پابندی میں کس طرح جی رہا ہے۔ان کے اشعار میں اس منظر نامے کی واضح صورت نظر آتی ہے۔

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.4 2023

جیون کو دکھ ، دکھ کو آگ اور آگ کو پانی کہتے
بچے لیکن سوئے ہوئے تھے کس سے کہانی کہتے
سچ کہنے کا حوصلہ تم نے چھین لیا ہے ورنہ
شہر میں پھیلی ویرانی کو سب ویرانی کہتے(۱۳)

اب جہاں سچ کہنے کی پاداش میں انسان رسوائی اور ذلت کا مستحق ٹھہرے تو اس عالم میں سچ کی آواز کہاں سے آئے گی۔ایسی صورت میں سچ بولنے کی یہ خواہش ایک حسرت کا روپ دھار لیتی ہے۔

انسان اپنے خیالات کو اپنے اندر مرتا دیکھتا ہے اور یہ حالت بیرونی دنیا میں طاقت کے راج اور جبر کے ساج کو پروان چڑھنے اور کھل کھیلنے کا موقع فراہم کرتی ہے ۔اس گھٹن زدہ ماحول میں چپ رہنا ہی عافیت ہے۔آنس معین اپنے ایک شعر میں اسی حالت کا بیان مشورے کے انداز میں کرتے ہیں جو دراصل مشورہ نہیں بلکہ اس عہد پر طنز ہے۔وہ کہتے ہیں:

سوچ رہے ہو سوچو لیکن بول نہ پڑنا
دیکھ رہے ہو شہر میں کتنا سناٹا ہے(۱۴)

آنس معین کے پاس زندگی کے لطیف جذبات کی عکاسی بھی بھرپور ہے۔وہ انسانی تعلقات کے لطیف پہلوؤں کو بھی بیان کرنا خوب جانتے ہیں۔ان کے ہاں روایتی عشقیہ موضوعات یا ان موضوعات کے بیان کے لیے عامیانہ پن نہیں ہے۔ان کے نزدیک تعلقات میں آتی سرد مہری ایک المیہ ہے۔وہ اس سرد مہری کی عکاسی کرتے ہوئے بھی اسے معصوم جذبے کی تبدیلی کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔انسان جسے چاہتا ہے اس کے وجود کو اپنے لیے موجود کی سطح پر آسائش میں دیکھتا ہے اور پھر جب یہ تعلق پہلے جیسا جذباتی اور خوشگوار نہ رہے تو جذبوں میں انے والی سرد مہری اس کی سوچ بھی بدل دیتی ہے۔اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تعلقات میں آئی ہے بس یہ تبدیلی
ملیں گے اب بھی مگر انتظار کم ہو گا
پلٹ تو آئے گا شاید کبھی یہی موسم
تیرے بغیر مگر خوشگوار کم ہو گا(۱۵)

ہجر و وصال کی کیفیت معاملات دل کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔تعلقات میں آتی دوری کا تصور انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے۔باہمی معاملات پہلے سے نہیں رہتے تو جدائی مقدر بنتی ہے کسی بھی انسان کے لیے یہ جدائی کاٹنا سہل نہیں۔اس حالت میں یاد ہی واحد سہارا ہے جو انسان کو ڈھارس مہیا کرتا ہے مگر حالات کی ستم ظریفی یہاں بھی ایک خوف کی صورت ساتھ ساتھ لگی رہتی ہے۔انسان اس قدر مجبور ہو جاتا ہے کہ یاد کے اس روشن پہلو سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ساحر لدھیانوی نے اسے بیرونی دنیا اور معاشی صورتحال سے جوڑ کر کہا تھا:

تیرے جلوے کسی زردار کی میراث سہی
تیرے خاکے بھی میرے پاس نہیں رہ سکتے(۱۶)

اس موضوع کے بیانیے میں بھی ان کی انفرادیت ان کی خوبی نظر آتی ہے۔اس ممکنہ جدائی کو اور یاد کے چھن جانے کو وہ وہم اور خوف کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔انہیں پیش آنے والے حادثات کا ادراک ہے۔وہ اس یاد کے چھن جانے کے احساس کو کس خوبصورت تلازمی میں نبھاتے ہوئے کہتے ہیں:

ہے دیپ تیری یاد کا روشن ابھی دل میں
یہ خوف ہے کہ جو ہوا آئی ذرا اور(۱۷)

آنس معین کی غزل کا علامتی نظام بھی وہ صدقہ حامل ہے۔ان کی شعری علامتیں پہلو در پہلو نئے مفاہیم کی علمبردار ہیں۔وہ معلوم اور معروف علامتوں کا استعمال کرتے ہیں اور معنوی نظام سے ان میں جدت اور ندرت پیدا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ان کے ہاں روشنی کی علامت اسی معنویت کے افق کے ساتھ جلوہ گر ہوتی نظر آتی ہے:

بدن کی اندھی گلی تو جائے اماں ٹھہری
میں اپنے اندر کی روشنی سے ڈرا ہوا ہوں(۱۸)

پھراسی روشنی کو نئے معنوں میں پیش کرتے ہیں۔یہ روشنی جو زندگی کی علامت ہے اب اس نہج پہ لے آئی ہے کہ اس روشنی کی موجودگی میں زندگی کی رمق موجود نہیں۔اس حالت کاادراک کسی باشعور شاعر کو ہی ہو سکتا ہے جو انسانی جذبات کے پیمانے میں روشنی کی فراوانی میں روشنی کی کمی محسوس کرے۔شاعر کے نزدیک دنیا کی ظاہری ترقی انسان کی بات نہیں تشفی اور کل بھی تسلی کے لیے ناکافی ہے۔جدید ترقی کے اس دور میں روشنیوں سے آنکھیں تو چکا چاند ہو سکتی ہیں مگر ان میں زندگی کے آثار ناپید ہیں۔وہ زندگی جو احساس سے عبارت ہے۔انسانی بصیرت کے سفر میں تصور انسان اور بقائے کائنات کا خیال ایک ادھورا خواب بنتا جا رہا ہے۔انسان اس ترقی کے ہاتھوں اپنے حسیات کو بلبلاتا دیکھتا ہے۔آنس ایسے انسانوں کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں:

ہزاروں قمقموں سے جگمگا اٹھا ہے گھر لیکن
جو من میں جھانک کے دیکھوں تو اب بھی روشنی کم ہے(۱۹)

ان کی شاعری میں روشنی کی علامت معنوی سطح پر بھرپور اور اہمیت کی حامل ہے اس سے ایک علامت کے ذریعے وہ زندگی کی مختلف حقیقتوں کو بیان کرتے اور اس کے معنی عام انسان کے سامنے پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ان کا یہ شعر دیکھیے جو روشنی کے نئے معنی تراشتا ہوا نظر آتا ہے:

چھوٹ جائیں قیدِ شب سے رسم خود سوزی کے بعد
آؤ جگنو بن کے نکلیں روشنی اوڑھے ہوئے(۲۰)

آنس معین کی غزل میں پائی جانے والی علامتوں میں سے ایک اہم علامت پانی اور اس سے جڑی علامتیں بھی ہیں۔ جنوبی پنجاب بالخصوص بہاولپور کے مضافاتی علاقوں کے شعرا کے ہاں دریا سیلاب اور صحرا کی علامتیں زیادہ نظر آتی ہیں آنس معین کا تعلق جنوبی پنجاب کے شہری علاقے سے تھا ان کے اندر ایسی کیفیات موجود تھیں جو صحراؤں میں بسی پیاس سیلاب کے ساتھ بہتے گھروں اور بارش میں مکانات کے انہدام کے دکھ کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ان کی غزلوں میں نہ علامتوں کا استعمال کثیر الجہت بھی ہے اور زندگی کا ترجمان بھی۔وہ سمندر کی علامت کو گہرائی اور وسعت کے ساتھ ملاتے ہوئے پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے اندر کی دنیا کو سمندر سے مشابہ قرار دیتے ہوئے اس گہرائی کی بات کرتے ہیں جو عدم اطمینان نا آسودگی اور نہ رسائی کے جذبات سے پر ہے۔ان کی یہی کیفیات ہیں جن تک کسی کی رسائی ممکن نہ ہوئی اور یہی نا آسودگی انہیں زندگی سے دور عین عالم جوانی میں موت کی آغوش میں لے گئی۔ان کے اشعار اس بات کا واضح واضح اشارہ دیتے ہیں کہ انہیں اس نارسائی کا دکھ ہے اور یہ دکھ ایسا لازوال دکھ ہے جہاں ان کے اندر کی گہرائی کو دیکھا سمجھا اور اس تک سفر نہیں کیا گیا۔اگر کوئی ان کے اندر کوئی جھانک سکتا اور ان کے احساسات کو پرکھ سکتا ہوں تو شاید نتائج کچھ مختلف ہوتے۔وہ اپنے اندر کے دکھ کو ان اشعار میں یوں بیان کرتے ہیں:

خالی ہے مکاں پھر بھی دیے جاتے ہو دستک
کیا روز نے دیوار سے اندر نہیں دیکھا
حیرت سے جو یوں میری طرف دیکھ رہے ہو
لگتا ہے کبھی تم نے سمندر نہیں دیکھا(۲۱)

انسان ایک وسیع سمندر کی طرح ہے اس بات میں تو شک نہیں کیا جا سکتا مگر انسان کی داخلی زندگی تک کسی بھی جذبے کی رسائی ہر اندروں بھی شخص کا المیہ ہے۔شاعر جو معاشرے کا حساس فرد ہے اسے دنیا بھر کے دکھ اور تکالیف اپنے محسوس ہوتے ہیں وہ خود کو اس بھری دنیا میں تنہا اور اکیلا محسوس کرتا ہے اور ان تمام انسانوں کا نمائندہ بنتا ہے جنہیں اس اذیت سے دوچار ہونا پڑا۔شاعر اس منزل پر ان کے ساتھ کھڑا ہے جہاں کوئی ان کا ساتھ نبھانے والا نہیں۔آنس معین نے پانی کی علامت کو برسات کی صورت میں الگ روپ میں دکھایا ہے۔عمومی طور پر اردو شعرا نے بارش کو خوشگواریت کی علامت بتایا جذبات میں آنے والے جوار بھاٹا بھی اسی کی بدولت ہیں۔ساون اور برسات کے تناظر میں شاعرانہ بیانیہ اسے خوش کن اور جذبات انگیز قرار دیتا ہے۔آنس معین کے نزدیک بارش کا بیرونی روپ اہم ہے جو پسماندہ طبقے کے لیے مشکلات اور مصائب ساتھ لاتا ہے۔ آنس معین کی بھرپور شعری زندگی کا سفر جس شعر پر ختم ہوا وہ بھی اسی تناظر میں ہے:

میں بارش کی دعائیں کیسے مانگوں

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.4 2023

میری بستی میں کچے گھر بہت ہیں[۲۲]

بارش اور پانی کا ایک روپ سیلاب بھی ہے۔ سیلاب جو بستیاں برباد کرتا ہے جو کھیتیاں اجاڑتا ہے۔ زندگی کی علامت پانی ایک قہر بن کر برستا ہے تو اس کی بہتات لوگوں کی تباہ حالی کا پیغام لے کے آتی ہے۔ پانی جو پیاس کی علامت تھا اس کی فراوانی نے انسان کو جن مصائب میں مبتلا کیا اس کی ترجمانی آنس معین کے ہاں فلسفیانہ انداز میں نظر آتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان کی حالت کا ادراک ضروری ہے یہ سمجھ لینا کہ پانی پکارنے والا شخص پیاس کا مارا ہوا ہے ضروری نہیں کہ درست عکاسی کرے۔ ہونٹوں پر پانی کی صدا اور پکار سے پانی کی بہتات بھی مراد ہے جس سے بچنے کے لیے ڈوبنے والا پانی پانی پکارتا ہے اور روایت میں بستہ انسان اسے پیاس سمجھ لیتا ہے۔ نے اپنے ایک شعر میں اسی کیفیت کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

وہ جو پیاسا لگتا تھا سیلاب زدہ تھا
پانی پانی کہتے ڈوب گیا ہے[۲۳]

دریا سمندر سیلاب بارش کی علامتوں کو نئے معنی دینے والے آنس معین نے سراب کو بھی نئے معنی بخشے ہیں۔ وہ سراب کی علامت میں انسان کے لیے کیا اہم ہے اور کیا نہیں دونوں سطحوں پر بدلتے ہوئے زاویوں کو بیان کرتے ہیں۔ باہمی تعلقات میں اداکاری اور شعبدہ بازی سے شعبدہ بازی سے اعتماد جیتنے والا اس اطمنان میں مبتلا رہتا ہے کہ اس کا چہرہ کسی کے سامنے آیا نہیں اور فریب کھانے والا اس خلوص سے فریب کھاتا ہے کہ وہ اس طرح کی اداکاری کا بھرم رکھے۔ جو ظاہر اس کے سامنے ہے اس کی اصل کو جانتے ہوئے بھی خود کو فریب خوردہ بنانے میں عافیت محسوس کرے۔ تعلقات میں یہ وہ منزل ہے جہاں خود فریبی معلوم حقائق پر چادر ڈال کر لوگوں کے اعتماد کو آزماتی ہے اور پانی نظر آنے والے لوگ کسی سراب سے کم نہیں ہوتے۔ خلوص اور اعتماد کرنے والا شخص اس خیال کو بھی اپنے لیے نعمت سمجھتا ہے اور اس سراب پر اطمینان رکھتا ہے:

نظر کو خوب خبر تھی کہ ایک سیلاب ہے وہ
مگر نظر کو بھروسہ اسی سراب پہ تھا[24]

آنس معین کی غزل زندگی کی بھرپور ترجمان ہے وہ ارضی حقیقتوں کو نئے رنگ میں دیکھتے اور انہیں نئے معنی پہناتے نظر آتے ہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ میں شاید وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے خزاں کو درختوں کے لیے آسائش قرار دیتے ہوئے انہیں پتوں کے بوجھ سے نجات کی علامت قرار دیا ہے وہ کہوں میں بسی اداسی اور چھپی خاموشی کو زبان عطا کرتے ہیں۔ ان کا نظریہ شعر یہ ہے کہ زندگی کی تفہیم اتنی سہل اور آسان نہیں جتنی حضرت انسان سمجھ بیٹھا ہے۔ وہ انسان کو زندگی کی اصل تصویر دکھانے کے خواہش مند نظر آتے ہیں۔ ان کی غزل کی رنگارنگی اور موضوعات میں تنوع انہیں غزل کا ایک اہم اور نمایاں شاعر ثابت کرنے میں مددگار ہے۔ ان کی یہ غزل ان کے شعری رجحانات کی نمایاں غزل کہی جاسکتی ہے:

کتنے ہی پیڑ خوف خزاں سے اجڑ گئے
کچھ برگ سبز وقت سے پہلے ہی جھڑ گئے
وہ چاندنیاں بھی اپنے معاون سفر میں تھیں
تھک کر پڑاؤ ڈالا تو خیمے اجڑ گئے
اب کے میری شکست میں بھی ان کا ہاتھ ہے
وہ تیر جو کمان کے پنجے میں گڑ گئے
سلجھیں تھی گتھیاں میری دانست میں مگر
حاصل یہ ہے کہ زخموں کے ٹانکے اکھڑ گئے
اس بند گھر میں کیسے کہوں کیا طلسم ہے
کھولے تھے جتنے کفر وہ ہونٹوں پہ پڑ گئے[۲۵]

غزل کا یہ جواں مرد شاعر اپنے مختصر شعری سفر میں دنیائے شعر کو قیمتی اور بے بہا سرمایہ عطا کر گیا۔ ان کی غزلوں اور نظموں کی تعداد کم سے ہی مگر شعری

Vol.6 No.4 2023

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

معیارات پر پوری اترتی لازوال غزل اور بھرپور نظم ان کی پہچان بنی۔غزل کی طرح ان کی نظم بھی منفرد ہے۔ان کی نظموں کے موضوعات انہیں دوسرے شعراء کے مقابلے میں انفرادیت عطا کرتے ہیں۔ان کی نظم موضوعاتی تنوع کی عمدہ مثال ہیں۔ان کی ہر نظم کا نیا موضوع زندگی کے نئے درواکرتا ہے۔ان کی ایک نظم ''عدم سے آگے''ان کی نمایاں کہی جاسکتی ہے اور ان کی شاعری کا معتبر حوالہ ہے:

وجود کیا ہے؟
عدم سے پہلے کی ایک منزل!
وہ ایک لمحہ جو منجمد ہے
محیط ہے ساری زندگی پر
گمان ہے یا کوئی حقیقت
کہ ایک پردہ ہے
ڈھانپ رکھا ہے جس نے ساری حقیقتوں کو
وہ تو بس عدم کو جانے کا راستہ ہے
کہ جس کی جانب ازل سے ہر شے رواں دواں ہے
عدم کہاں ہے
عدم تو انجانی سمت میں ہے
وجود اور عدم میں شاید ہزاروں صدیوں کا فاصلہ ہے
یہ بے نشان منزلوں کی جانب طویل سا ایک سفر ہے
کسے خبر ہے؟
وجود سے کب عدم کی سرحد میں ہوگا داخل
یہ کون جانے
عدم سے آگے بس ایک حد ہے
وہی ابد ہے (۲۶)

یہ زندگی کے اغاز و انجام کا احاطہ کرتی ہوئی نظم ہے۔شاعر نے اس فلسفیانہ موضوع کے لیے بھی سادہ اور سلیس اسلوب کا انتخاب کیا ہے۔سادہ سلوک کے باوجود موضوع میں فکر کی گہرائی اور تہہ داری اس قدر زیادہ ہے کہ اس کی پرتیں کھولنے میں کئی صفحات صرف کرنے پڑیں گے۔زندگی کی تمام تر حقیقت اور اس کے مکمل سفر کا احاطہ اس نظم میں سمو دیا گیا ہے۔انور جمال اس نظم کو صوفیانہ نظم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آنس ایک ایسا صوفی ہے جس کے سامنے اس قسم کی ہزاروں صورتیں ہیں۔موجود عدم کے اور ازل کے کئی زاویے موجود ہیں۔''(۲۷)

شاعر نے اس نظم میں کائنات کے اربوں سالوں کے سفر کو وہ اختصار عطا کیا ہے۔اردو شاعری میں جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔کائنات کی ساری حقیقت اور اس کا مقصد چند مصروں میں سمودیا گیا ہے۔عدم اور وجود کا باہمی رشتہ جو اہل تصوف کے لیے ہزاروں سالوں سے معمہ بنا ہوا ہے آنس نے ان سب کو رہنمائی فراہم کی ہے۔اس نوجوان شاعر کی یہ فکری پختگی اس کے فلسفہ حیات کی بھی غماز ہے اور کائنات کے لیے ایک منفرد زاویے کی آئینہ دار بھی ہے۔اس نظم کے تناظر میں اگر ان کے آخری خط اور خودکشی کی وجہ دیکھیں تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کیا آنس نے عدم اور ازل کے پیمانے کو جان لیا تھا اور ان کا یہ عمل اسی معرفت کے سفر کا آخری پڑاؤ بنا۔وہ لکھتے ہیں:

''کتاب زیست کا جو بھی صفا الٹتا ہوں اس پر وہی تحریر نظر آتی ہے جو پچھلے صفحے پر پڑ چکا ہوں۔اسی لیے میں نے ڈھیر سارے اوراق چھوڑ کر وہ تحریر پڑھنے کا فیصلہ کر لیا ہے جو آخری صفحے پر لکھی ہوئی ہے۔''(۲۸)

Vol.6 No.4 2023
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ان کی ایک اور نظم ''قامت'' بھی زندگی کے فلسفے کی عکاس اور انسانی زندگی کے معیارات کو چیلنج کرتی ہوئی نظم ہے۔ اس نظم میں وہ خود کو انسانوں کا نمائندہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور اپنے ہم جنسوں سے مخاطب ہیں کہ تم مادی دنیا کے مادی پیمانوں سے مادی حقیقتوں کو تو ناپ سکتے ہو لیکن تو میں انسان اور انسانی قدروں کی کچھ خبر نہیں ہے۔ تمہارے نزدیک تمہارے پیمانے حتمی سہی مگر تم جان لو کہ تم ازل سے اشرف المخلوقات قرار دیے جانے والے انسان کا اور اس کی قامت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ تم آگ پانی ہوا مٹی پتھر وزن اور طول و عرض کو آخری اور حتمی سمجھ بیٹھے ہو۔ یہ پیمانے کائنات کی جزئیات کو تو ناپ سکتے ہیں مگر مجھے انسان کی قامت کا اندازہ تمہارے بس کا روگ نہیں۔ اپنی اس نظم میں وہ انسانی احساس کو سب سے بہتر اور کارگر پیمانہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

عجب معیار ہیں تمہارے
دہکتے سورج کی جس کسوٹی پر
لوگ آتش فشاں کی حدت کو ناپتے ہیں
اسی کسوٹی پر تم پرکھتے ہو
ٹمٹماتے چراغ کو بھی
تم آزماتے ہو آئینوں کو پتھروں سے
حساب کرتے ہو
دامنوں کی نمی کا غم سے
تمہارے ٹھٹھرتے وجود کا کیا مقابلہ ہے
خنک ہوا اور چاندنی سے
عجب معیار ہیں تمہارے
مگر میں انسان ہوں
تمہارے ہر ایک معیار سے بڑھ کر
اگر کبھی تم کو یہ گماں ہو
میں پستہ قد ہوں
تو میری قامت کو ناپ لینا صلیب سے تم (۲۹)

آنس معین کی یہ فکری سطح انہیں عظیم اور پختہ کار شعراء کے مقابل لا کھڑا کرتی ہے۔ ان کی نظموں کے موضوعات میں زندگی منکشف ہوتی ہے۔ وہ زندگی کا اصل روپ دکھاتے ہیں۔ فکر و فلسفہ کی معراج پر کھڑی ان کی نظمیں متاخرین کے لیے ایک راستے کا تعین کرتی ہیں۔ ان کا شعری فلسفۂ حیات و ممات کے چکر کی عکاسی کے ساتھ ساتھ زمین کے اوپر موجود انسانی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ زندگی کی فلسفیانہ اساس اور حقیقتوں کے ادراک کا شعور رکھتے ہیں۔

وہ عقل و دانش اور فکر و شعور کے پیمانوں کو جھنجوڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ محض لفظوں کی جگالی زندگی کی تفہیم نہیں کر سکتی۔ وہ زندگی کے مسائل و مصائب اور زمینی حقیقتوں کو سمجھنے کے لیے فکر و فلسفہ عقل و دانش وہ محدود قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی کے مسائل کا صرف ایک ہی حل ہے جسے احساس کہا جا سکتا ہے۔ ان کے نزدیک ان مسائل کا ادراک صرف اسے ہو سکتا ہے جسے ان دکھوں کو بسر کرنا آتا ہو۔ وہ دانشوروں کو مخاطب کرتے ہیں اور زمینی مسائل پر ان کے شعور کو سوالیہ نشان کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ زمینی حقائق کی سمجھ بوجھ میں ان کی دسترس پر سوال اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں:

نبض کے اوپر ہاتھ جمائے
ایک صدا پر کان لگائے
دھڑکن سانسیں گننے والو
تم کیا جانو

مبہم چیزیں کیا ہوتی ہیں؟
دھڑکن کیا ہے، جیون کیا ہے؟
سترہ نمبر کے بستر پر
اپنی قید کا لمحہ لمحہ گننے والی
یہ لڑکی جو
برسوں کی بیمار نظر آتی ہے تم کو
سولہ سال کی ایک بیوہ ہے
ہنستے ہنستے رو پڑتی ہے
اندر تک سے بھیگ چکی ہے
جان چکی ہے
ساون کیا ہے؟
اس سے پوچھو
کانچ کا برتن کیا ہوتا ہے؟
اس سے پوچھو
مبہم چیزیں کیا ہوتی ہیں؟
سونا آنگن تنہا جیون کیا ہوتا ہے (۳۰)

اس قدر کرب اور تکلیف صرف ایک شاعر کے بیان میں نہیں آسکتی۔ صرف شاعر نہیں مسیحا ہے۔ اسے دنیا اور دنیا کے دکھوں کو سمجھ نہ آتا ہے۔ وہ نباض ہے جو ہنسنے اور رونے کے معنی جانتا ہے جنہیں ان کے درمیان حائل ایک لمحے کی فرق اور ادراک ہے۔ وہ دنیا کے مسائل کو گہرائی میں جا کر دیکھتا ہے ایسی گہرائی جہاں انسان کی اصل ہے جہاں عمر اور جنس کے پیمانے نہیں۔ کچھ ہے تو صرف انسان اس کے جذبات ان احساسات اور جذبات جذبات کے پیچھے کار فرما محرکات وہ ان سب کا ادراک دنیا کو کرانا چاہتا ہے۔ وہ انسان کے اربوں سالوں کے فکری ارتقاء کے سفر سے مطمئن نہیں وہ ایجادات کی تعداد کو فکری ترقی نہیں سمجھتا۔ اسے انسانی دکھوں کا علاج چاہیے جہاں مرض سے لڑتے ہوئے انسان کا بیڈ نمبر نہیں بلکہ اس کے درد کی شدت اہم ہے۔

آنس معین نے چھبیس سال کی عمر میں خود کشی کی۔ اس عمل کے پیچھے کیا تھا یہ ایک معمہ ہے جسے وہ اپنے ساتھ منوں مٹی میں لے گیا۔ سات سال پر محیط شعری سفر اور مختصر حیات میں اس نے دنیا شعر و ادب کو نئے زاویے فراہم کیے۔ اس کی نظمیں غزلیں اور اشعار پر کسی بھی شاعر کی چھاپ نہیں وہ منفرد ہے اور اس انفرادیت نے ان کی شاعری میں وہ تاثیر پیدا کی ہے کہ بہت کم لکھنے والا بہت بھاری بھر کم دیوانوں اور دیوان والے شاعروں سے بلند تر نظر آتا ہے۔ آنس نے کہا تھا کہ اس کی کہانی ان کے بعد کوئی اور سنائے گا یہ بات ان کی شاعری کی تفہیم پر بھی صادر آتی ہے۔ ابھی نقادوں کے لیے طویل سفر ہے کہ اس شاعری میں فکری پہلوؤں کی کہانی سنائیں اور ان میں چھپے معانی کو سامنے لانے کی کوشش کریں۔

آنس معین کی شاعری نظم اور غزل دونوں صورتوں میں فکری اپج کے ساتھ ایک الگ عہد الگ رجحان اور منفرد تجربے کی حامل ہے۔

حوالہ جات

1۔ علی معین کی گفتگو، بمقام شعبہ اردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد، ۲۲ ستمبر ۲۰۲۲
2۔ محفل، ماہنامہ لاہور، جلد35، شمارہ9، ستمبر 1989ء، ص:111
3۔ صفیہ عباد، ڈاکٹر، راگ 'رت' خواہش مرگ اور تنہا پھول، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، 2020ء، ص: 187
4۔ جعفر شعرازی، بڑا شاعر، مشمولہ: محفل، ماہنامہ، لاہور، ستمبر 1989ء، ص:39
5۔ فخر الدین بلے، بنام ڈاکٹر وزیر آغا، مشمولہ: اوراق، سالنامہ، لاہور، جلد 21 ، اکتوبر۔ نومبر 1986ء، ص:198

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.4 2023

6۔ کلام آنس معین، مشمولہ: اوراق، سالنامہ، اکتوبر۔ نومبر 1986ء، ص: 201
7۔ ایضاً، ص: 207
8۔ ایضاً، ص: 206
9۔ محفل، ماہنامہ، لاہور، ستمبر 1989ء، ص: 86
10۔ ایضاً، ص: 88
11۔ کلام آنس معین، مملوکہ: ظفر معین، مقیم کراچی
12 ایضاً
13۔ ایضاً
14۔ ایضاً
15۔ ایضاً
16۔ ساحر لدھیانوی، کلیات ساحر، لاہور: علم و عرفان پبلشرز، 2017ء، ص: 419
17۔ کلام آنس معین، مملوکہ: ظفر معین، مقیم کراچی
18۔ ایضاً
19۔ ایضاً
20۔ صفیہ عباد، ڈاکٹر، راگ، رت، خواہشِ مرگ اور تنہا پھول، ص: 195
21۔ کلام آنس معین، مملوکہ: ظفر معین، مقیم کراچی
22۔ آنس معین کا آخری آٹو گراف، مشمولہ: محفل، ماہنامہ، لاہور، ص: 21
23۔ محفل، ماہنامہ، لاہور، ص: 58
24۔ ایضاً، ص: 60
25۔ کلام آنس معین، مملوکہ: ظفر معین، مقیم کراچی
26۔ نظم بعنوان عدم سے آگے، مشمولہ: محفل، ماہنامہ، لاہور، ص: 54
27۔ انور جمال، روح کی منجدھار کا شاعر، مشمولہ: اوراق، سالنامہ، لاہور، ص: 205
28۔ آنس معین کا آخری خط، مشمولہ: اوراق، سالنامہ، لاہور، ص: 197
29۔ محفل، ماہنامہ، لاہور، ص: 57
30۔ اوراق، سالنامہ، لاہور، ص: 200